''آگ کا دریا'' ایک تہذیبی مکالمہ

ریاض حسین بلوچ*

ڈاکٹر عقیلہ شاہین**

Abstract:

The novel 'Aag ka darya' by Qurat ul Ain ,is based on a deep insight and scholarly thinking about history and civilization. Its subject matter covers the dialogues among civilizations that had been the part of the subcontinent for more than two thousand years. The subcontinent has never been remained under the dominancy of one nation. It has always been influenced by scores of nations diverse civilizations from the Aryans to the British who attacked and transformed the region with their own cultures and traditions. Today, not a single nation could claim to be the sole heir of the civilization of the subcontinent. Though the author, Qurat ul Ain has highlighted this issue in all her novels, this novel also propagates the same point. The prime quality of the novel 'Aag ka Darya' is that it covers the long span of eras of the subcontinent. After rationalizing all the reasons, the present article explains the argument of the novelist in the light of those recent debates about the clashes of civilizations and reveals the real motives of the novelist who preaches dialogues instead of clashes among civilizations.

زمانہ قدیم سے ہندوستان کبھی کسی ایک قوم کا مستقر نہیں رہا۔ آریاؤں سے لے کر انگریزوں تک متعدد بیرونی اقوام نے ہندوستان کا رخ کیا۔ ان میں سے ہر نو وارد قوم کسی نہ کسی تہذیب کی علم بردار تھی، چنانچہ اس ملک کی تہذیب ہمیشہ منقلب ہوتی رہی اور رد و قبول کا یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ آج برِصغیر پاک و ہند میں بسنے والی

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

** (ریٹائرڈ) شعبہ اُردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ اس تہذیب کی اکیلی وارث ہے۔اس ناول میں پیش کیا گیا بنیادی نقطہ نظر بھی یہی ہے۔اگر چہ قرۃ العین حیدر نے یہی نقطہ نظر قریباً اپنے تمام ناولوں میں پیش کیا ہے لیکن 'آگ کا دریا' کی انفرادیت یہ ہے کہ ایک تو اس ناول کی اساس تاریخ وتہذیب کے گہرے مطالعہ اور دانشورانہ غور وفکر پر رکھی گئی ہے اور دوسرا یہ کہ اپنے دعویٰ کی دلیل کے لیے مصنفہ نے ایک طویل زمانی دورانیے کا انتخاب کیا ہے۔

چوتھی صدی قبل مسیح سے تقسیمِ ہند تک یہ ناول ڈھائی ہزار سال پر محیط تہذیبی مکالمہ ہے۔اس طویل ترین تہذیبی مکالمے کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ہر دورانیے کا آغاز مکالمہ میں نئی نسلوں اور قوموں کی شراکت سے ہوتا ہے۔ پہلے شریکِ مکالمہ اپنی جگہ پہ قائم رہتے ہیں اور دوسرے شامل ہوتے جاتے ہیں،سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ ہندوستان ہمیشہ سے متنوع افکار ونظریات کی اماج گاہ رہا ہے۔ یہاں کوئی ایک نظریہ کبھی غالب نہیں رہا۔مختلف العقائد اور مختلف الخیال طبقے صدیوں تک باہم ملتے تو رہے، بچھڑا کوئی نہیں۔ہندِ قدیم میں معلوم معاشرتی اور فکری تغیر اس وقت پیدا ہوا جب آریا قبائل نے سرحد پار سے آکر مقامی آبادی کو نئی قسم کی پوجا پاٹ اور اور نئے انداز کے سماجی نظام سے متعارف کرایا۔صدیوں بعد برہمن کی وضعی الوہیت کے خلاف مہابیر نے جین مت اور گوتم نے بودھ مت کی بنیاد رکھ کر لوگوں کو نئی فکر سے آگاہ کیا۔پھر مسلمان مبلغین،صوفیا اور فاتحین آئے، جو خالص الہام اور عظیم الشان اقدار کے حامل تھے۔اور آخر میں مغربی کوچہ گردوارد ہند ہوے، ایک نہ ختم ہونے والے فساد کے ساتھ یہ اس ملک کو ایسے ادارے اور نظام بھی دے کر گئے جن کو برتے بغیر کوئی قوم جدید دور میں داخل ہی نہیں ہوسکتی تھی۔نجی حکومتوں کے بننے بگڑنے سے قطع نظر کسی کی آمد واخراج سے بحیثیت مجموعی ہندوستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ یہ تغیر وتبدل اس خطے کے لیے مفید رہا ہے۔

ناول میں مکالمے کا پہلا دورانیہ گوتم کی وفات کے قریباً ایک صدی بعد شروع ہوتا ہے۔جب بودھ کی تعلیم زوروں پر تھی۔جسے برہمن پسند تو نہیں کرتے تھے لیکن عام آدمی کے لیے بدھ کے فلسفہ میں اک پناہ کا احساس ضرور تھا۔ناول کا آغاز ایک برہمن (گوتم نیلم بر) اور بدھ (ہری شنکر) کی ملاقات اور مکالمے سے ہوتا ہے۔ بلا شبہ اس عہد کا ہندوستاں فکری اعتبار سے اقوامِ عالم میں سب سے آگے تھا۔''سوفسطائی... شک پرست... دہریے... منطقی... جنگلوں میں بحثیں کرتے مل جاتے تھے۔یہ بھی ان میں سے کوئی دل جلا ہے۔گوتم نے سوچا۔ان گنت منطقی گنگا کی وادی میں گھومتے پھرتے تھے۔ماہرینِ کلام روایتی مذہب پر حملے کرتے، آرا اور اشیا کی اضافت کو ثابت کرنے میں مصروف رہتے۔ان میں سے بہت سے مابعدالطبعیاتی نظریات کے حامل تھے۔اکثر مادہ پرست تھے۔جین اور بودھ فلسفی بیک وقت یوگی بھی تھے اور سوفسطائی بھی۔انہی گھنے جنگلوں میں بڑے بڑے شہزادے اور بادشاہ جٹائیں بڑھائے سادھوؤں کی سی زندگی گزارتے تھے اور کپلا وستی کے شہزادے نے بھی جنگل کا راستہ اختیار کر کے ملک کی اس روایت کو نبھایا تھا۔ان کی آمد کے وقت باسٹھ مدرسہ ہائے فکر اپنی مختلف شاخوں سمیت موجود تھے۔خیالات

کی اس سلطنت میں، انہوں نے بھی، جو شاکیہ منی سدھارت کہلائے، فلسفے کی ایک اور نو آبادی قائم کر دی تھی۔ باسٹھ نظریے.... اور زندگی ایک ہے.... اور انسان تنہا ہے۔ گوتم نے آنکھیں بند کر لیں اور اسی طرح لیٹا رہا۔''(۱)

یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں اجین، نالندہ اور تکشلا (ٹیکسلا) کی درس گاہیں آباد تھیں۔ ہمالہ کی ترائیوں کے گھنے جنگلوں میں جگہ جگہ آشرم برہم چاریوں سے بھرے پڑے تھے۔ ہر نظریے کے پیروکاروں نے اپنے اپنے ذہن کے دروازے کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ لفظ سے خدا تک اور گنت ودیا سے ساہتیہ اور دھیان تک کچھ بھی موضوع بحث ہوسکتا تھا۔ لفظ پرست ویدانتی برہمن اور لفظ گریز ناستک بودھ ایک مندر کے فرش پر بیٹھ کر خدا، انسان، زندگی کی ماہیت، علم، علم کی ماہیت، وقت اور لفظ کی ابدیت، پرم آتما اور جیو آتما، لفظ اور غیر لفظ اور قانونِ علیت کے ہوتے ہوئے چیزوں کا باہم لاتعلق ہونا وغیرہ پہ مکالمہ کر سکتے تھے، مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون کا ہے سے بھاگ رہا تھا، کون کس کی تلاش میں تھا، کس کی تلاش ابھی جاری تھی اور کس کی ختم ہو چکی تھی۔ بودھ لفظ گریزی کے باوجود لفظ کا ناٹک کھیلنے سے باز نہیں آتا تھا اور برہمن ویدوں کے اصلی علم کے ہوتے ہوئے حقیقت سے بے خبر تھا۔ کوئی لفظ کے کھوج میں نکلتا تو بھٹک جاتا تھا، کوئی 'اوم' اور 'ساپاساسا' کے تین سروں میں کائنات کو بندھا دیکھتا ہے۔ کوئی الفاظ کے بنا خالص خیال تک پہنچنے سے قاصر تھا اور کوئی خدا کے بغیر گیان کے تمام مراحل طے کر جاتا تھا۔ تمام فرقوں کا مقصودِ جستجو ایک، لیکن راستے اور طریقے مختلف تھے۔ کوئی رنگوں اور لفظوں کے وسیلے سے حقیقتِ مطلق کے کھوج میں ہے، کوئی سُر اور رقص کے آہنگ میں اسرارِ کائنات کا متلاشی ہے۔ کوئی سرے سے ہر سوچ اور عمل سے انکاری تھا۔

ہندوستان کی ہر آواز،، ہر رنگ اور ہر آہنگ حتیٰ کہ ہر موسم اور ہر چیز آج بھی کسی آفاقی حقیقت کی نمائندہ ہے۔ 'سُر مسلسل ہے، گیت بدل جاتے ہیں، کائنات ایک آہنگ پر رقصاں ہے' سنگیت کار کے فن میں ابدیت کا دھارا بہہ رہا ہے۔ پوری کائنات آوازوں اور رنگوں میں تقسیم ہے۔ گوتم کے عہد کا ہندوستان تعبیرِ کائنات کے لیے ویدوں کی تعلیم کو ناکافی سمجھتا تھا۔ بودھ گیان اور علم کو اپنی نجات کا وسیلہ سمجھتا تھا، باطن کو رہنما جانتا تھا۔ اس کے نزدیک مذہب کے بغیر بھی حقیقت تک رسائی کا امکان موجود تھا ''مذہب اب محض کمتر درجے کا علم سمجھا جاتا تھا۔ اصل چیز فلسفہ تھا اور مابعد الطبعیات۔ سارے ملک میں خیالات کی فرمانروائی تھی اور آزادی افکار اور مذہبی رواداری۔ ایک ہی کنبے کے افراد برہما کے مختلف مظاہر کی پرستش کرتے اور متضاد نظریوں میں یقین رکھتے۔ مادہ پرست، ثنویت کے قائل، ملحد، بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے کیوں کہ سچائی کی تلاش ان سب کا مشترکہ مقصد تھا۔ ہر فلسفی اپنی اپنی جگہ سے، جو اس نے اپنے لیے منتخب کی تھی ذرہ برابر سرکنے کو تیار نہ تھا، مگر ان سب نے علمِ معقولات کو سب سے زیادہ فوقیت دی تھی''(۲) کپلا ناستک ہے، ویدانتی مواحد ہے، مہاویر کہتا ہے دنیا ابدی ہے، شاکیہ مُنی کو اس سے سروکار نہیں ہے کہ خدا ہے یا نہیں ہے، بہر حال زندگی دکھ ہے۔ ہر شے تکلیف میں ہے۔ ایک ہی ملک میں رہنے والے اور ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے مختلف نظریوں، فلسفوں اور عقیدوں پر یقین رکھتے تھے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول کے ابتدائی سوصفحات میں چار پانچ صدی قبل مسیح کے ہندوستان میں رائج فلسفیانہ اور مذہبی نظریات وافکار کا ایسا انتخاب پیش کیا ہے جس کے مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ دنیا میں کچھ نیا نہیں ہے۔ بھلے وہ الہام ہی کیوں نہ ہو۔ ابتداء سے مذاہب کے تین موضوعات رہے ہیں۔ خدا، کائنات اور انسان۔ نیکی اور بدی کا تصور بھی دراصل خدا، کائنات اور انسان کے باہمی ربط وضبط سے فروغ پانے والے اعمال سے متعلق ہوتا ہے۔ تمام مذہب کا بنیادی کام خداشناسی اور کائنات کی تفہیم ہے۔ خدا اور کائنات کے بارے میں نئے اور پرانے دین داروں کے ادراکات و انکشافات میں بڑی یکسانیت ہے۔ ''خدائے واحد، جو نہ مرد ہے..... نہ عورت۔ اس کی کوئی جنس نہیں، کوئی ثانی نہیں، نہ کسی نے اس کو پیدا کیا، نہ یہ کسی کو پیدا کرتا ہے، ایکا دیوا۔۔۔ جو دنیا کی تخلیق کا مادی سبب ہے لیکن خود غیر مادی ہے اور دنیا جو اس نے تخلیق کی بذاتِ خود غیر حقیقی ہے۔۔۔ برہسپتی کی حیثیت سے برہما خدائے نطق ہے۔ لفظ جو شروع میں تھا اور خدا تھا۔ (مدتوں بعد فلسطین کے حکماء یہ جملہ دہرا کر ایک نئے خیال کا پرچار کریں گے،)۔۔۔ شروع میں پانی تھا جس پر پرجاپتی ہوا کی طرح منڈلایا اور کائنات کی تخلیق کی (فلسطین کا فلسفی بعد میں کہنے والا تھا..... شروع میں پانی تھا جس پر خدا کی روح دھوئیں کی طرح منڈلاتی تھی۔۔)''(۳)

ناول میں مکالمے کا دوسرا دورانیہ سلطان حسین شرقی (۱۴۵۹ء) کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ ابوالمنصور کمال الدین سرجو ندی کے اسی گھاٹ پر کھڑا ہے جہاں سے دو ہزار سال قبل گوتم نیلم برنے پیرتے ہوے ندی کو پار کیا تھا۔ اب برگد کے سائے میں کشتیاں نہیں بندھی تھیں، اور نہ ہی ملاح نظر آرہے تھے۔ وہاں کسی پیر کا مزار تھا جہاں عورتیں گھونگھٹ کاڑھے مزار پر پھول چڑھا رہی تھیں۔ چمپا ندی میں پیرتی ہوئی گھاٹ پر آئی ہے، جونپور میں چمپا کا 'مہاتما سمان بادشاہ' (سلطان حسین شرقی) رہتا ہے۔ ایک دن بھین نے چمپا کو ایک پیارا گیت حسینی کانڑا میں سنایا جو دراصل سلطان کی سنگیت تھی۔ ابوالمنصور کمال الدین سلطان کے کتب خانے کا نگران تھا، سلطان نے اسے سنسکرت میں لکھے پونے دو ہزار سال پرانے تانب پتروں کا پتا لگانے کے لیے ایودھیا کے پنڈتوں کے پاس بھیجا ہے، اور وہاں کے پنڈت ایک نئے چکر 'بھگتی' میں پڑے ہوے تھے۔ گویا اب ہندِ قدیم کے باسٹھ نظریوں کے مکالمے میں مسلمانوں کا ترسیٹھواں نظریہ بھی شامل ہو چکا ہے۔

گوتم نیلم بر کی شراوستی کو اب بہرائچ کہا جاتا ہے۔ جہاں محمود کے سپہ سالار مسعود غازی کا مزار ہے۔ نالندہ، وکرم شیلا، اجین اور امراوتی کے عظیم الشان دارالعلوم بند ہو چکے تھے، آشرم ویران ہو چکے تھے، سلطان حسین شرقی بہلول لودھی اور سکندر لودھی سے شکست کھانے کے بعد قدیم نسخوں کی ورق گردانی اور نئے نئے راگوں کی سیاحت کر رہا ہے۔ ایودھیا میں کمال الدین بھگت کبیر کے پیروکاروں شنکراچاریہ، ولبھ اور رامانند کے ناموں سے متعارف ہوا ہے کیوں کہ ایودھیا میں اسے ایک برہمن زادی چمپا ملی ہے جو ہر وقت کبیر کا ذکر کرتی تھی۔

انسان جن بستیوں کو بساتے ہیں وہ ضرور اجڑتی ہیں۔ بغداد اور سکندریہ تباہ ہوے، متھرا، نالندہ، اجین اور قنوج تباہ ہوے، لیکن اس تباہی و بربادی میں علم اور انسانیت بہرصورت باقی رہے۔ ''اس خوں ریز دور میں جنوب کے پرسکون ساحلوں پر خوب صورت کلیسا تعمیر کیے جا رہے تھے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی شاداب بستیوں میں پھولوں کے تہوار منائے جاتے تھے، اور عرب تاجروں کی آبادیوں میں رات کے وقت قانون، عود، نے اور نفیر کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ اور مہابلی پورم کے مندروں میں رقص ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی عام انسان تھے مگر امن سے رہنا جانتے تھے۔''(۴)

پندرویں صدی کے نصف آخر میں پورے عالم نے کروٹ لی اندلس سے لے کر ہندوستان تک پورے عالم اسلام میں بھی حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ مسجد قرطبہ میں مصلوب عیسیٰ اور کنواری مریم کی تصویریں لگ چکی تھیں۔ کلیسائے صوفیہ میں صفیں بچھ گئیں تھیں، اذان اور نماز ہونے لگی تھی۔ پرتگال اور سپین کے طالع آزما ملاح ہندوستان کے ساحلوں کی طرف بڑھنے لگے۔ مسلم سلاطین ہند کی دہلی تیمور کے ہاتھوں تاراج ہوئی جو اولاد تو چنگیز کی تھا لیکن مذہباً مسلمان تھا، انتشار اور بدامنی کی وجہ سے امن پسند اہلِ اللہ پر ہجوم شہروں سے دور جنگل اور بیلے آباد کرنے لگے، خانقاہیں خرقہ پوش فقیروں سے بھر گئیں۔ ہندوستان اسلام کو اپنے فکری وسائل کے مطابق سمجھنے کی کوشش میں لگ گیا تھا۔

ملک الشرق خواجہ جہاں نے سلطنتِ شرقیہ اس وقت قائم کی جب شاہانِ تغلق تیمور کے خوف سے پایہ تخت چھوڑ کر جان بچاتے پھرتے تھے۔ شرقی سلطان دکنی فرمانرواوں کی طرح اپنے آپ کو مقامی کہتے تھے۔ علم و دانش کا متلاشی ابوالمنصور کمال الدین، سلطان حسین شرقی کی معیت میں کئی بار لودھیوں سے ناکام جنگیں لڑنے کے بعد خوں ریزی سے جب تنگ آ گیا تو تلوار کو دریا کی لہروں کے سپرد کیا اور کاشی پہنچ گیا جہاں میاں کبیر کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ اس کی بانیاں گاتے پھرتے تھے۔ بھگتی فروغ پا رہی تھی۔ خدا اور انسان سے محبت کا راج تھا۔ ایک ہندو ماں ہماوتی کی آغوش میں پرورش پانے والا سلطان سکندر لودھی جو کٹر مسلمان تھا اپنی خالص اسلامی سلطنت اور غیر اسلامی رعایا میں ایسی خرافات کو سخت ناپسند کرتا تھا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ ''سارا دیس ایک نئے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ پچھلے تین سو سال سے اس صوفی بھگتی مارگ پر ایک بڑا خوب صورت قافلہ رواں تھا۔ اس قافلے میں کیسے کیسے لوگ شامل تھے۔ اجمیر کے معین الدین اور ایٹے کے امیر خسرو اور دلی کے نظام الدین اور گجرات کے نرسنگھ مہتا اور بنگال کے بیر بھوم کا چنڈی داس اور بہار کی متھلا پوری کے ودیاپتی اور مہاراشٹر کا درزی نام دیو، پریاگ کے رامانند اور جنوب کے مادھو اور ولبھ اور بادشاہوں اور چھتر پتی راجاؤں کے درباروں اور امراء، وزراء اور سپہ سالاروں کی دنیا سے نکل کر کمال نے دیکھا کہ دوسری دنیا میں مزدور اور نائی اور موچی اور کسان اور غریب کاریگر آباد تھے۔ یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر خرقہ پوشوں کی حکومت تھی۔(۵)

ہندو بھگت اسلام کی مساوات سے ویسے ہی متاثر ہو رہے تھے جیسے وہ کبھی جین مت اور بدھ کے فلسفہ اخلاقیات سے متاثر ہوے تھے۔ ہندوستان کے ستائے ہوے لوگ ہمیشہ سنتوں اور صوفیوں کے گرد جمع ہوتے رہے جہاں انہیں طاقت ور اور ضابطہ پرست مذہبی طبقے سے تحفظ ملتا تھا۔ اب یہ فریضہ بھگت اور صوفی سرانجام دے رہے تھے۔ اونچی ذات کے برہمن اور دہلی کے ملاؤں کا یہاں زور نہیں چلتا تھا۔ یہ انوکھی دنیا، محبت کی دنیا تھی۔ عام آدمی کو حکومتوں سے کیا سروکار تھا۔ حاکم ترک ہوں یا راجپوت ہندوستان کا ہندو مسلم کسان ہل چلائے گا۔ بادشاہوں کے تو اپنے پیٹ نہیں بھرتے تھے۔

پنڈتوں اور مولویوں نے دہلی کے سلطان سکندر سے فریاد کی ''یہ بدعتی جولاہا عوام کو گمراہ کر رہا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لوگوں نے گنگا میں ڈبو دیا مگر وہ ضدی جولاہا 'جل تھل راکھت ہیں رگھوناتھ، کا نعرہ لگاتا پانی سے نکل آیا''(۶) سکندر لودھی نے غیر اخلاقی رجحانات کے خاتمے کے جذبے سے سرشار ہو کر ''بہڑ ائچ کے جلوس کی ممانعت کر دی جو ہر سال مئی جون میں سالار مسعود غازی کی یاد میں نکالا جاتا تھا''(۷)۔ میاں کبیر کو حکم ملا کہ وہ بنارس چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں۔ کمال کو پھر ایک سفر درپیش تھا۔ وہ پٹنہ پہنچا جہاں اسے معلوم ہوا کہ سلطان حسین شرقی بھاگل پور میں جلاوطنی کے عالم میں وفات پا گیا ہے۔ پھر وہ بنگال میں دریائے گنگا کے کسی نامعلوم گھاٹ پر اترا، بنگال جو سریلی آوازوں کا بھنور تھا، کمال گلی گلی گانے والے اور روپ کتھائیں سنانے والے کوچہ گرد شاعروں کے ساتھ ساتھ یہاں گھومتا رہا۔ اس نے بنگالی زبان سیکھی اور کئی سال تک کہانیاں اور گیت لکھتا رہا۔ (جیسے دو ہزار سال پہلے گوتم نیلم بر لکھتا تھا)۔ سونار گاؤں کی ایک شودر عورت شنیلا سے شادی کر کے اس کا نام آمنہ بی بی رکھا اور بانس کے بنے جھونپڑے میں رہنے لگا۔ ابوالمنصور کمال الدین اب بنگالی تھا، اب وہ یکسر مختلف انسان تھا۔ سلطان کے کتب خانے کا نگران یک تارے پر وشنو نغمہ الاپ رہا تھا۔ سہسرام کا شیر خان اور ہمایوں دونوں مسلمان تھے 'دارالسلام بھی دارالحرب بن سکتا ہے اگر اس میں شر کا وجود ہو' لڑائیوں کے لیے دو مذہبوں کا نہیں بلکہ دو سیاسی طاقتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ابوالمنصور شیر شاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں اپنے گھر کی دہلیز پر مارا گیا۔ قاتلوں اور مقتول دونوں کا تعلق ایک مذہب سے تھا۔ لیکن بنگال کا ابوالمنصور کمال الدین آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ناول میں مکالمے کا تیسرا دورانیہ بنگال میں آنگریزوں کی آمد سے لے کر مکمل انیسویں صدی کا احاطہ کرتا ہے۔ اب سرزمینِ ہند پر ایک اور اجنبی قوم وارد ہو چکی ہے۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی کا یورپ ایک نئے عزم اور نئی سوچ کا حامل ہے۔ ایک طویل کشمکش کے بعد یورپ صرف کلیسا کے جبر سے ہی نہیں بلکہ جغرافیے کی قید سے بھی آزاد ہو چکا تھا۔ یورپی ملاح تاجر دنیا کے ہر اس خطے میں پہنچے جہاں جہاں سے مادی نفع کے حصول کا امکان تھا، چنانچہ وہ ہندوستان کے ساحلوں پر بھی پہنچے۔ ابھی یورپ بیدار ہو رہا تھا کہ سولہویں صدی کے آتے آتے سرزمینِ ہند پر مندر اور مسجد کے ساتھ ساتھ گرجے بھی تعمیر ہونے لگے تھے۔ مسلمان اور عیسائی تو صدیوں سے باہم آشنا

تھے۔فلسطین سے سپین تک ان کی دوستیوں اور دشمنیوں کے کئی سلسلے تھے تاہم ہندوؤں اور عیسائیوں کی یہ اولین با ضابطہ آشنائی تھی۔اٹھارویں صدی میں بنگال کا ابوالمونشور نیل کے کھیتوں میں مشقت کرتا تھا۔سرل ہارورڈ ایشلے اس کا نیا آقا تھا۔ ہندوستان میں یہ نو دولتیے انگریز تاجر شاہانہ زندگی گزارتے تھے۔ پلاسی کی جنگ کے بعد کا انگریز روایتی تاجر نہ رہا۔حکومت اور دولت کی ریل پیل نے ان کی بود و باش کو بھی بدل ڈالا۔

''حرم، حقہ، شعروشاعری، ناچ رنگ، مرغ بازی ....یہی مشاغل ان فرنگیوں کے تھے.... ہندوستانی نوابوں اور انگریز اونچے طبقے نے آپس میں سمجھوتہ کر کے ایک انتہائی مہذب فضا کی بنیاد ڈالی تھی۔ دیوانی ملنے کے بعد انگریز سویلین بنگال میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ لوگ بے حد کم عمر میں انگلستان سے یہاں آتے اور بہت جلد ساری ہندوستانی خصلتیں اختیار کر لیتے۔کلکٹر کی حیثیت سے اضلاع میں تعینات ہونے کے بعد اپنا وقت وہاں کے راجاؤں اور نوابوں اور زمینداروں کی صحبت میں گزارتے۔ بنگال کی جاگیردارانہ تہذیب میں فرنگی افسر بھی گھل مل چکا تھا۔''(۸) دولت منداور بااختیار انگریز مقامی اونچے طبقوں میں شادیاں بھی کر رہے تھے۔شاہ عالم ثانی کی بیٹی فیض النساء کی شادی ایک انگریز سے ہوئی تھی اور غازی الدین حیدر کے حرم میں فرنگی کرنل ایش کی بیٹی براجتی تھی۔سرل نے بھی رادھے چرن کی بیٹی شنیلا کو اپنی کوٹھی میں ڈال لیا۔

انگریز بنگال کی معیشت پہ مکمل طور پر قابض ہو چکا تھا۔تیل، نمک، چھالیا، تمباکو، چاول عام آدمی کی دسترس میں نہیں تھے۔ بوڑھے ہندو اور مسلمان سراج الدولہ کو یاد کر کے آہیں بھرتے تھے جب کہ انگریز کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ بالخصوص ہندو سابقہ مسلم حکمرانوں کا ذکر اچھے لفظوں میں کریں۔ جب ڈھاکے کے انگریز کلکٹر نے رادھے چرن کو بلا کر کہا کہ مسلمان نوابوں نے تم لوگوں کو اپنی ندانتظامی سے تباہ کر دیا ہے تو رادھے چرن کا ردِعمل بڑا راست تھا۔''تم جھوٹ بولتے ہو صاحب! ہمارے نوابوں کے یہاں بدانتظامی نہیں تھی۔ میں کائستھ ہوں۔ میرے پرکھ صدیوں سے مرشد آباد میں حکومت کا انتظام کرتے آئے ہیں۔ میں آج بوڑھی گنگا کے کنارے اس جھونپڑی میں رہ رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنی خوش حالی کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش وحواس بھی کھو دیے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بکتے ہو.....تم.....اور جب رادھے چرن غصے سے کانپنے لگے۔۔۔اس دن وہاں ایک مشنری بھی موجود تھا جو اپنا سفر نامہ لکھ رہا تھا اور یہ مکالمہ سننے کے بعد اس نے قلم بند کیا 'بنگال کا ہندو مسلمان نوابوں سے نفرت کرتا ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے خون کے پیاسے ہیں۔۔۔یہ دونوں کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔(۹)

سرل کے دفتر کا بنگالی کلرک گوتم نیلم بردت پہلا مقامی کردار ہے جو مغربی تعلیم حاصل کرتا ہے۔شاہان اودھ کا آخری زمانہ ہے۔سرل اسے چند کاغذات دے کر کلکتہ سے لکھنو بھیجتا ہے۔ناول کے اس حصے میں اودھ کے نوابوں کی شان وشوکت، مذہبی رواداری، وسیع المشربی اور لکھنو کی مشترکہ تہذیب کے ہر پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ خوب صورت باغات، محلات، بارونق اور بھرے پُرے بازاروں اور نفاست پسند لوگوں کا شہر ہے۔ یہاں مذہب

پرجا کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہندو تعزیہ داری کرتا ہے تو مسلمان دیوالی میں شریک ہے۔ ہندو امراء نے مسجدیں اور امام باڑے بنوا رکھے ہیں۔ اودھ ہندِ قدیم کے تہذیبی مراکز کی سرزمیں ہے جہاں ایرانی شیعوں کی اولاد ڈگ وجے رام چندر کے سنگھاسن پر براجمان ہے۔ اس شہر کے ہندو آصف الدولہ کا نام لے کر دکانیں کھولتے ہیں۔ قریب ہی بہڑائچ (شراوستی) ہے۔ سالار مسعود عرف بالے میاں نے بالناتھ کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ جب کہ ''سرل ایشلے کے دوست بشپ ہیبر اور ان کے ساتھی، جو آج کل اس ملک میں چاروں طرف گھوم کر اپنے سیاحت نامے قلم بند کر رہے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس ملک کا ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے اور ویسٹ منسٹر میں ہماری حکومت کو چاہیے کہ ان وحشیوں کو اپنی جہالت اور تعصب سے نجات دلانے کے لیے جلد از جلد مزید انجیلیں اور بندوقیں بھیجے''(۱۰)

ناول کے اس حصے میں گوتم نیلم بردت بنگالی ہندوؤں کے اس جدید تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی بھی کرتا ہے جو رام موہن بابو کی رہنمائی میں مسلسل آگے بڑھ رہے تھا اور مستقبل پر نظریں جمائے ہوے تھا۔ اور نواب ابوالمنصور کمال الدین علی رضا بہادر نصرت جنگ عرف کمن ان مسلمانوں کا نمونہ ہے جن کے نزدیک ماضی پرستی ہی زندگی کا اہم ترین فلسفہ ہے۔ ریاست کے الحاق کے بعد یہ نواب صاحب بھی سلطان عالم واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج کلکتہ میں قیام کرتے ہیں اور گوتم نیلم بردت سے بھی ان کی یاد اللہ ہے جو اب کلکتے کے مشہور اخبار نویس بن چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ نواب کمن کربلا جانے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر مٹیا برج میں ہی فوت ہو گئے۔ گوتم نیلم بردت کا بیٹا منور نجن لکھنؤ کے کیننگ کالج میں قانون کا لیکچرر بن جاتا ہے۔ پروفیسر گوتم نیلم بردت اپنے بیٹے سے ملنے کلکتہ سے لکھنؤ آتے ہیں۔ منور نجن سنگھاڑے والی کوٹھی میں رہتے ہیں جو انہوں نے کرائے پر لے رکھی ہے۔ بنگالی گوتم نیلم بردت کی نسل اب بیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے۔

ناول میں چوتھے اور آخری مکالمے کا دورانیہ قریباً ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۶ تک ہے۔ بیسویں صدی کے ہندوستان کی سماجی معروضیت تمام سابقہ ادوار سے مختلف اور پیچیدہ ہے۔ انگریز تاجر اور حاکم اب اتنا اجنبی نہیں رہا جتنا اٹھارویں صدی میں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اگرچہ بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا، لیکن پرانا جاگیردارانہ نظام نہ صرف باقی تھا بلکہ جدید تعلیم اور اس کے توسط سے ملنے والے انتظامی عہدوں کے بل پر ایک نئی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اس فیوڈل ارسٹوکریٹ طبقے میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ اس طبقے کے پاس تین چیزیں ایسی تھیں جو بیک وقت کسی عام ہندوستانی کے پاس نہیں ہو سکتی تھیں، وسیع جائیدادیں، جدید تعلیم، اور انگریز حاکم کا اعتماد۔ ان تین امتیازی حیثیتوں نے بلا امتیاز مذہب اس طبقے میں حد درجہ یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہرگز نہیں تھا کہ اس طبقے کے ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یوں تو عالی شان بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہنے والا یہ طبقہ پورے ہندوستان میں موجود تھا لیکن ناول میں جن خاندانوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق لکھنو سے تھا۔ ایک خاندان سنگھاڑے والی کوٹھی میں رہتا تھا۔ یہ کوٹھی نواب سعادت علی خان کے وزیرِ مالیات

رائے زادہ بخشی مہتاب چند نے تعمیر ائی تھی۔اب یہ ان کے پڑپوتے کی ملکیت تھی۔ برسٹر رائے زادہ کانگرسی تھے،اور اردو شاعری پر مضمون لکھتے تھے۔گھر کی زمینداری تھی۔ان کا ایک بیٹا (بھین۔ ہری شنکر سریواستوا) تھا اور دو بیٹیاں (بڑی لاج اور چھوٹی نرملا) تھیں۔ بیٹے کو وہ کیمبرج بھیجنا چاہتے تھے، کیوں کہ وہ خود بھی کیمبرج سے پڑھ کے آئے تھے۔ بڑی لڑکی میرس کالج سے ففتھ ایر پاس کر چکی تھی، بی اے کے بعد اس کا بیاہ ہونا تھا۔ چھوٹی لامارٹیز سکول میں اور لڑکا یونیورسٹی میں ایم اے فارسی کر رہا تھا۔دوسرا خاندان 'گلفشاں' میں رہتا ہے۔نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور کا تعلق لکھنو کے نواب خاندان سے ہے، نواب ابوالمنصور کمال الدین علی رضا عرف نواب کمن ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ان کی ایک اور ملکیتی کوٹھی 'خیابان' کے نام سے دہرہ دون میں بھی تھی۔اگر نواب تقی رضا بہادر کے بھتیجے سید عامر رضا کو نہ شمار کیا جائے تو ان کے خاندان کے افراد کی تعداد بھی اتنی ہی ہے جتنی برسٹر رائے زادہ کے افرادِ خانہ کی ہے۔عامر رضا نواب کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا جن کا سوئٹزرلینڈ میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔اب یہ گلفشاں میں رہتا تھا۔جائیداد میں حصہ دار اور نواب کی بڑی بیٹی تہمینہ (آپی) سے منسوب تھا۔امپیریل سروس کے مقابلوں میں ناکام ہو کر اب نیوی میں کمشن لے چکا تھا۔تہمینہ ایم اے فائنل میں تھی۔چھوٹی بیٹی طلعت میرس کالج میں نرملا کے ساتھ پڑھتی تھی۔کمال رضا بھین کا چہیتا دوست تھا۔ان خاندانوں میں ہر سماجی اور نجی سطح پر یکسانیت پائی جاتی تھی۔یہ اک ہی طرح کے لوگ تھے۔''ان کے یہاں موٹریں تھیں اور ٹیلی فون لگے تھے اور صبح ہوتی تو ان کی لڑکیاں سائیکلوں پر اپنے اپنے پھاٹکوں سے نکل کر ازابلا تھوبرن کالج یا یونیورسٹی کا رخ کرتی تھیں۔یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔یہ بڑے شریف لوگ تھے۔باوضع اور خوش حال اور باعزت۔ان کے یہاں کے دستور بھی ایک سے تھے۔رنج اور خوشیاں، مسائل یکساں تھے۔ان کے فرنیچر۔ان کے باغوں کے پودے۔ان کی کتابیں۔لباس سب چیزیں ایک سی تھیں۔ان کے ملازم ان کے نام ان کی دلچسپیاں''(۱۱) کانونٹ، لامارٹیز، میرس کالج، کالون تعلقہ دار کالج، کیننگ کالج، ازابلا تھوبرن کالج اور کیمبرج ان کے خاندانی درس گاہیں تھیں۔یہ باپ دادا سے ہی انہیں اداروں کے پروردہ تھے۔ان کی لڑکیاں موسیقی اور آرٹ کی تعلیم حاصل کرتی تھیں، نجی پارٹیوں میں گاتی اور رقص کرتی تھیں۔اور لڑکے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھتے تھے، اور سول سروسز میں جاتے تھے۔ان خاندانوں کے اشتراکات مذہب، نسل اور جغرافیے کی بجائے سماجی مراتب اور جدید تعلیم کی بنیاد پر ہیں جو سراسر معاشی اور مغربی تھے۔قدیم وضع اور جدید تعلیم نے مل کر ان کے اندر ایسا تحمل، رواداری اور آسودگی پیدا کر دی تھی جو ہندوستان کے عام ہندو مسلم طبقوں میں مفقود تھی۔اگر اپنے سے علاوہ اس طبقے کی ہندوستان میں کے کسی دوسرے طبقے سے تعلق قائم ہو سکتا تھا تو وہ انگریز تھا۔اور مقتدر انگریز کا بھی اگر کسی مقامی طبقے کو منہ لگاتا تھا تو وہ یہی لوگ تھے۔جدید تعلیم یافتہ مقامی امراء اور انگریز کا سماجی تعلق صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھا۔کیمبرج اور آکسفرڈ میں جا کر یہ تعلق اور مضبوط ہو جاتا تھا۔

ان خاندانوں کی کوٹھیوں کے آنگن الگ الگ تھے لیکن ان کے دلوں کے آنگن جڑے ہوے تھے۔سنگھاڑے والی کوٹھی کی لڑکیاں کالج سے واپس آتے ہوے گلفشاں رک جاتی تھیں اور گلفشاں کی لڑکیاں سنگھاڑے والی کوٹھی پہ جا کے دم لیتی تھیں۔دونوں خاندانوں کے نوجوان بچے ہر خاندان کے بزرگوں کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں میں برابر شریک رہتے تھے۔ان گھریلو تعلقات اور باہمی اعتماد کی نوعیت ہری شنکر کی زبانی کچھ یوں تھی؛''کمال نے شاید آپ کو بتایا ہو گا کہ میں اس کا بڑا چہیتا دوست ہوں۔اس کی بہن تہمینہ سے، جسے گھر میں اپی کہا جاتا ہے، مجھے اتنی ہی محبت ہے، جتنی لاج اور نرمل سے، لیکن میرا اور کمال کا اپی کے لیے دوڑ بھاگ کرتے کرتے ناک میں دم آجاتا ہے۔''اللہ، ہری شنکر ہمرے لیے باٹا سے یہ جوتوں کی جوڑی بدلواتے لانا'۔'اے میاں ذری آج امین آباد جاؤ تو حاجی صاحب سے کہنا ہمری ساری کب تلک رنگ کر دیں گے؟''اے جناب! حضرت گنج جاتے ہیں؟ ذرا ہمارے اور لاج کے لیے ماری والوسکا کے دو ٹکٹ خرید لائیے گا''

> ''خدا کے لیے اپی آخر تمہاری وہ سائیکل کس مرض کی دوا ہے۔ایسی کاہلی بھی کس کام کی'میں بعض اوقات جھنجھلا کر کہتا' اور اتنی بڑی جہاز کی جہاز موٹر جو گیراج میں پڑی جھک مارتی ہے وہ کس دن کام آئے گی۔اتنی گھام میں ایسی ایسی بیگار کروا کے ہم مزدوروں کا خون پسینہ ایک کرواتی ہو''(۱۲)

یہاں کے تعلیمی اداروں میں ہندو مسلم، ہر رنگ و نسل اور مشرق و مغرب کے نوجوان پڑھتے ہیں اور ان اداروں میں وہ تمام آسائشیں اور معیارات موجود تھے جو اس طبقے کو درکار تھے۔میرس کالج میں موسیقی کی اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جاتی ہے۔سنگھاڑے والی کوٹھی کی نرملا اور گلفشاں کی طلعت وہاں موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔اور ازابلا تھوبرن تو تھا ہی اپنی مثال آپ۔قرۃ العین نے ناول میں اس ادارے کا جو اس کا نقشہ کھینچا ہے۔اس سے تو یہ تعلیمی ادارہ کم اور محل زیادہ لگتا ہے۔دو منزلہ یونانی طرز کے بلند پورٹیکو کے ستونوں پر کھڑی عمارت، جھلملاتے فرش، شفاف شیشوں والے طویل دریچے، مرمریں زینے۔جھاڑ فانوس، فن پاروں سے مزین دیواریں، جگہ جگہ بچھے ایرانی قالین اور سوئمنگ پول؛ یہ آرائش و زیبائش لڑکیوں کے کالج کی ہے۔ہوسٹل کسی ہندوستانی ریاست کے مہمان خانوں سے بڑھ کے تھے۔نشاط محل اور نونہال منزل کہلاتے تھے۔یہ مشرق میں امریکہ کی بنائی ہوئی ایک عظیم الشان درس گاہ تھی۔پورنماشی کی راتیں، مختلف گوشوں میں بجتی مغربی دھنیں، سبزہ زار، پھولوں کے کنج، سایوں کی طرح سارے میں گھومتی پھرتی لڑکیاں اور برگد کا پرانا درخت جو کیمپس کے کونے میں کھڑا ہے یہ سب مل کر اس ادارے کو ایک آشرم کا روپ دیتے ہیں جسے کل پتی گرو پرشوتم کے بجائے مغرب کے پروفیسر چلا رہے تھے۔یہاں کوئی سمن اپنا گھر تج کر تو نہیں بیٹھی تھی لیکن معاشی خوش حالی نے انہیں کٹی میں بیٹھی تارک الدنیا راجکماری سمن سے بھی زیادہ، حقیقی زندگی سے بے نیاز کر دیا تھا۔ان لڑکیوں کے حصولِ تعلیم کا مقصد متوسط اور مفلس طبقے کے پیشِ نظر تعلیمی مقصد سے

مختلف تھا۔ ازابلاتھوبرن میں ہندوستان کے ہر علاقے اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں تھیں، ہندوستان میں منائے جانے والے تمام تہوار ان کے تہوار تھے، جیسے سنگھاڑے والی کوٹھی کے رائے زادہ اور گلفشاں کے نواب تقی بہادر کے بچے ہولی، دیوالی اور عید اور محرم ایک ساتھ مناتے تھے اسی طرح یہاں تہوار منانے کا منشاء ہندو، مسلم، سکھ یا عیسائی ہونے کا ثبوت فراہم کرنا نہیں بلکہ باہمی خوشیوں میں شریک ہونا تھا۔ ''مرہٹی، گجراتی، بنگالی، مدراسی، اڑیہ، نیپالی، پنجابی، پٹھان، یورپین، امریکن، برمی، سنگھالی، ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں کی زبان یہاں نہ سنی جاتی ہو۔ مذہباً یہ لڑکیاں ہندو ہیں اور مسلمان ہیں اور سکھ ہیں اور عیسائی ہیں اور بدھ ہیں اور یہودی۔ دنیا کا کوئی عقیدہ نہیں جس کا پیروکار یہاں موجود نہ ہو۔

> ''اس کالج کی طالبات اپنی سادگی کے لیے مشہور ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ سفید ساریاں پہنتی ہیں اور جس طرح کے فیشن یہ کرتی ہیں سارے صوبے میں ان کی نقل کی جاتی ہے۔ اس ارسٹوکریٹ کالج میں سیاسیات کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا۔ محض دنیا میں گریس فل اور متوازن طریقے سے زندگی بسر کرنے کے فن پر توجہ دی جاتی ہے، ہم دینے کے لیے لیتے ہیں یہاں کا موٹو ہے۔''(۱۳)

اس طبقے کے فکری معیارات مغرب سے ماخوذ تھے۔ انہیں آزادی اور آسائش بہت عزیز تھی۔ تعلیم و تربیت، رقص و سرود، پکنک تہوار، حتیٰ کہ اس طبقے کا باہم متحد رہنا اور انگریزوں کے ساتھ نجی مراسم قائم رکھنا جیسی تمام مساعی اپنے خاص طرز حیات کو بحال رکھنے کے لیے تھیں۔ فکر و نظر کے اعتبار سے یہ لوگ ایک عالمی شناخت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں کہیں یورپ کا قبضہ تھا وہاں ایسے لوگ ضرور مل جاتے تھے جو مقامی رجحانات کے ساتھ ساتھ مغربی معیارِ زندگی کے حامل تھے۔ پوری دنیا سے یہ لوگ اُٹھ اُٹھ کر یورپ کی درس گاہوں میں اکٹھے ہو رہے تھے اور ایک بین الاقوامی ثقافت معرض وجود میں آ رہی تھی۔ تاریخِ عالم میں پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ تمام تہذیبیں مادی معروضیت کے کسی ایک معیار پہ جمع ہو رہی تھیں۔ فیروز، زرینہ، کمال، سرل، نتاشا، طلعت، نرملا، شنیلا دیبی، مائیکل، ڈینس، ساجدہ بیگم، نرگیش، سریکھا، اینجلو، جون کارٹر، روشن آراء یہ سب عیسائی، یہودی۔ ہندو مسلم نوجوان لڑکے لڑکیاں کیمبرج کے طلبا تھے، بھلے یہ رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے اعتبار سے مختلف لوگ تھے لیکن زندگی کے دریا نے انہیں حالات کے ایک ہی دھارے میں لا کھڑا کیا تھا۔ یہ اپنے اپنے جغرافیوں اور نسلوں کے درمیان بھی لوٹ گئے ہوں گے، مگر ان کے فکری میلانات، شخصی ترجیحات، ادب آداب، اور سب سے بڑھ کر وہ تعلیم جہاں مذہب و ملت کا گزر نہیں تھا، عالمی ثقافت کے معتبر حوالے تھے۔ یہ لوگ مغربی معروضیت کے ساتھ ساتھ اپنی مقامی پہچان بھی رکھتے تھے۔ ''طلعت اور نرملا اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح دو رنگی فضاؤں کی پروردہ تھیں جسے انڈو یورپین تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ اس طبقے میں بچے Bilingual پیدا ہوتے تھے۔ انگریز گورنسوں کے ساتھ ساتھ قصباتی کھلائیاں اور انائیں ان کی پرورش کرتی تھیں۔ لڑکیوں کو کانونٹ اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا اور جب ان کی شادی

ہوتی تھی تو وہ ہفتوں مائیوں بٹھائی جاتی تھیں اور پرانے زمانے کی دلہنوں کی طرح شرماتی تھیں۔ اکثر ان کی شادیاں خلاف مرضی بھی کر دی جاتی تھیں۔ یہ لوگ موڈرن ہو چکے تھے لیکن الٹرا موڈرن نہیں بنے تھے۔ اخلاقی اقدار کے لحاظ سے یہ لوگ وکٹورین تھے۔ اور اپنی نیٹو روایات کے بھی شد و مد سے پابند۔ ظاہری طور پر انہوں نے مغربیت کا رنگ قبول کر لیا تھا لیکن اصلیت میں وہ بڑے سخت ہندوستانی تھے'' (۱۴)

ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کے روح فرسا حالات و واقعات کے باوجود ہند اسلامی اور انڈو یورپین تہذیب سرحد کے دونوں طرف، آج بھی نہ صرف قائم ہے بلکہ روز افزوں ہے۔ سوائے سندھ کے کچھ علاقوں کے، مغربی پاکستان کے اکثریتی مسلم صوبوں سے سے ہندوؤں کا تو مکمل انخلا ہو گیا تھا لیکن مشرقی پاکستان سے تمام ہندو آبادی بھارت منتقل نہ ہو سکی اور نہ ہی بھارت سے سب مسلمان پاکستان آ سکے تھے۔ اگر آزادی کے فوراً بعد کانگرس جاگیرداری کا خاتمہ نہ کرتی تو بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے والوں کی تعداد اور کم ہو جاتی۔ عامر رضا جیسے رئیس کامیاب مستقبل کے جس یقین کے ساتھ بلا تامل پاکستان چلے آئے، متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی چمپا احمد اسی یقین کے ساتھ ارادتاً مراد آباد کے ایک ویران محلے کٹھ گھر میں بیٹھی رہی۔ وہ کسی رئیس زادے سے کم پڑھی لکھی نہیں تھی۔ مملکتِ خداداد میں اس کی خوب صورتی اور تعلیم کے مطابق کوئی بڑا عہدہ اسے بھی مل جاتا۔ مگر اس نے ہجرت سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ نئے ملک میں ایک نئے انداز سے جینے کا پختہ ارادہ کر چکی تھی۔ وہاں اکیلی چمپا احمد ہی نہیں تھی اس کی کزنز زیبا اور مریم بھی تھیں جو بھاری اسٹوڈنٹ ورکر تھیں جو دلی کے سالانہ یونیورسٹی فیسٹول میں جانے کیا کیا کرامات کرتی تھیں، عوامی ناچ، موسیقی، سنگ تراشی ہر فن میں طاق تھیں۔ گیت تو اب بھی اس ویران محلے میں الاپے جا رہے تھے۔ چمپا کے دو اراب بھلے کوئی نہ بھی آتا تو وہ ذاتی کامیابی کے حوالے سے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ وہ ان سب سے مختلف تھی جو خدائے وقت کے فیصلوں اور اپنی اپنی شناختوں کے جبر کے بیچ کچلے جا رہے تھے۔ جو اپنے باطن کی آواز پر توجہ دینے اور اپنی اصل کے تقاضوں کو سمجھنے کے بجائے کسی دائمی مسافرت کا شکار ہو گئے۔ لکھنو، پیرس، کیمبرج، لندن، روم، اور میڈرڈ والی، نئے ہندوستان کی عاقل اور دلاور حسینہ چمپا احمد اپنے مسرتوں کے شہر واپس جا رہی تھی۔

''چمپا باجی اب تم کیا کرنے والی ہو؟
یہ بڑا بے رحم سوال تھا۔ ہم کسی کے مستقبل کے بارے میں کس طرح پوچھ سکتے ہیں!
'میں'۔ اس نے جواب دیا۔ میں بالآخر بنارس واپس جا رہی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔
جانتے ہو میرے آبائی شہر کا نام کیا ہے؟
ہاں۔ مسرت کا شہر، وہ بھی ایک نہ ایک دن واقعتاً مسرت کا شہر بننے گا۔ سارے شہروں کی طرح اس ملک کو دکھ کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دوسروں سے کیا مطلب؟ اس نے اپنے ہاتھ کھول کر غور سے انہیں دیکھا۔'' رقاصہ

کے ہاتھ، آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ؟ نہیں..... یہ صرف ایک عام، اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جواب کام کرنا چاہتی ہے۔''

وہ خاموش ہوگئی، کچھ دیر بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا''(۱۵)

ایسے موقعے پر اذان کا ہونا اور چمپا کا دوپٹہ سر پہ لینا بھی ایک تہذیبی رمزیت سے خالی نہیں ہے۔''یہ نئے ہندوستان کے مسلمان ہیں جو مذہبی رہنمائی کے لیے ایران وعرب سے ذہنی سلسلے قائم کیے ہوے ہیں۔۔۔احباب سے ملنے کے لیے کراچی یا لاہور جانا خوش قسمتی تصور کرتے ہیں۔۔۔لیکن ہندوستان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں''(۱۶)

ناول کے آخر میں ابوالمنصور کمال الدین کے بنگال کا ذکر کیا گیا ہے جواب مشرقی پاکستان بن چکا ہے۔کمال ایک لیبارٹری قائم کرنے کے لیے ڈھاکہ آیا ہوا تھا۔ریسٹ ہاؤس میں اس کی ملاقات سرل ہاورڈ سے ہوئی، جس کے بنگال میں چائے کے باغات تھے۔سرل اب منگل گیری کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔گورنر جنرل اور ان کی پارٹی بندرابن کا دورہ کر کے واپس کراچی جا چکی تھی۔بنگال اب بھی ویسا ہی تھا۔صبح شام مندروں میں گھنٹے بجتے تھے۔ہندو، مسلمان، بدھ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔یہاں سڑکیں نہیں تھیں، بانس کے جھونپڑوں میں رہنے والے جنگلی قبائل بیسویں صدی کے جدید سیاسی شعور سے نا آشنا، جوبس زندہ تھے۔رانگا ماٹی، راج باڑی، سیتا کنڈ، سری منگل، وغیرہ میں بس اتنی تبدیلی آئی تھی کہ پہلے یہ بنگال میں تھے اب مشرقی پاکستان کا حصہ تھے۔

''یہ کیسی دنیا تھی جو وجود میں آ گئی تھی؟ یہ گتھی کس نہج پر سلجھے گی؟ اور اس سارے گھپلے میں کتنی لاکھوں جانیں تلف ہوئیں، کتنے گھر لٹے، لاکھوں انسان خانماں برباد اور جلا وطن ہوئے اور کتنے کروڑ انسان جو پہلے بھوکے مرتے تھے اب بھی بھوکے مرتے ہیں''(۱۷)

یہاں تعینات، مغربی پاکستان کے افسر اپنی ملازمت کو کالے پانی کی سزا تصور کرتے تھے۔وحشی، بیک ورڈ، کاہل، سازشی، متعصب، بے ایمان، یہ سارے القابات اور نفرتیں مشرقی پاکستان کے لوگوں کے لیے تھیں۔گویا اٹھارویں اور انیسویں صدی کا زمانہ واپس لوٹ آیا تھا۔یاد رہے کہ یہ ناول بنگلہ دیش کے قیام سے کم وبیش ڈیڑھ عشرہ قبل لکھا گیا تھا۔قرۃ العین حیدر نے کراچی سے جانے والے حاکمان وقت کے رویوں کا ذکر جو یہاں اس ناول میں کیا ہے، کیا اربابِ اولیٰ اپنے عاملین کی ان نفرتوں اور بیزاریوں سے بے خبر تھے۔بنگالی تو مسلمان تھے، مغربی پاکستان کے کلمہ گو مسلمانوں کے دینی بھائی تھے۔''یقین فرمایئے، اعلیٰ افسر نے بات جاری رکھی، جس روز یہ خطہ پاکستان سے الگ ہوگا میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا اور خوشی کے مارے سات روز تک ڈرنک کروں گا۔ان کی ہر شے ہم سے مختلف ہے۔غیر اسلامی زبان بولتے ہیں۔وزیرِ اعظم کو پردھان منتری اور امن کو شانتی کہتے ہیں۔سنسکرت سے اپنا

ناططہ جوڑ رکھا ہے''(۱۸)

بنگالی مسلمان اور بنگالی ہندو کا صدیوں پرانا تہذیبی اشتراک اب بھی قائم تھا۔ندیوں، دریاؤں اور جنگلوں سے ڈھکی اس پراسرار سرزمین پر بسنے والے ہندواور مسلمان نے اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنے کے باوجود اپنے سماجی رشتوں کونہیں ٹوٹنے دیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ایک پوری نسل گم ہوگئی۔خاندان ملکوں ملکوں منتشر ہوگئے۔کروڑوں ہندو مسلم اپنے اپنے آبائی گھروں میں بیٹھے ایک دم غریب الوطن ہوگئے۔طلعت لندن میں بیٹھی رہی، چمپا احمد بنارس لوٹ گئی، کمال کراچی کی مہاجر بستیوں میں آباد ہوگیا۔نواب تقی بہادر آف کلیان پور گلفشاں سے عامر رضا کی کوٹھی کے احاطے میں بنی کاٹج میں آبسے۔مملکت خداداد پاکستان کے نئے نظریاتی معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے۔اس کے حصول کا جائز اور ناجائز ہونا قطعاً غیر اہم ہے۔جائز کام یہاں سفارش کے بغیر نہیں ہوتے اور ناجائز دھندا کرنے والے خود اتنے بااختیار ہیں کہ انہیں سفارش کی ضرورت نہیں ہوتی۔مہاجروں نے دائمی مہاجرت اپنالی ہے۔نہ یہ خود مقامی ہوے ہیں اور نہ انہیں مقامی ہونے دیا گیا ہے۔کیوں کہ یہاں نسبتی شناخت کی اہمیت بہرحال انسان ہونے سے زیادہ ہے۔پنجابی، سندھی، بنگالی، ایک سے بڑھ کر ایک نسبت یہاں موجود ہے۔صدیوں پہلے اِدھر اُدھر سے تشریف لانے والوں کی اولاد ابھی تک اپنی قدیم نسبتوں سے کام لے رہی ہے۔یہاں کے قدیمی خالص اہلِ ایمان کو مہاجر میں ہندوستانی نظر آتا ہے لیکن بوجوہ انہیں ہندوستانی نہیں کہا جاتا۔اور یہ مہاجر یہاں خود بھی اپنے آپ کو مرادآبادی، دہلوی، حیدر آبادی، میرٹھی، بٹالوی وغیرہ کہلواتے ہیں، حالانکہ یہ شہر اب بھارت میں پائے جاتے ہیں۔''یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔یہ لوگ ''جنگ'' اور ''انجام'' اور ''ڈان'' پڑھتے ہیں۔کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔سال میں ایک دفعہ ویزا بنوا کر خاندان کے بچے کھچے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں۔جس کو اب تک یہ ''گھر'' کہتے ہیں۔یعنی گھر دراصل سندیلہ یا مرادآباد ہے، ملک پاکستان ہے''(۱۹)

پاکستانی تہذیب تو بہت دور کی بات ہے، مغربی اور مشرقی ماہرینِ ثقافت کی کوششوں کے باوجود پاکستانی ثقافت آج تک معرضِ وجود میں نہیں آسکی۔نئی ثقافت کا معرضِ وجود میں نہ آنا اس قدر حیران کن نہیں ہے جتنا کسی نئی ثقافت کی ایجاد کا سوچنا مضحکہ خیز ہے۔ایسے کاموں کے لیے دانشوری کے نام پر جہلا کی ایک پوری کھیپ تیار کی گئی ہے جو آزادی سے قبل اس خطے کی پوری تاریخ کو ''زمانہ جاہلیت'' قرار دے چکے ہیں۔اور حکومتی خرچوں پر حکمت و دانش کی منزلیں طے کرنے والے یہ نابغے عالم گیر سطح پر پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔طبقہ اعلیٰ کی دنیا عوام الناس سے الگ ہے۔کسی قوم میں اقتدار و اختیار کی جس قدر منصبی، معاشی اور نظریاتی صورتیں ہوسکتی ہیں وہ یہاں صرف ایک طبقے میں یک جا ہوچکی ہیں۔ایک ہی طبقہ ہے جو اس ملک پر عفریت کی طرح چھایا ہوا ہے۔یہی طبقہ حاکم ہے،

سچا مسلمان ہے، لیڈر ہے، محبِ وطن ہے، پورے ملک کی قسمت کے فیصلے یہی طبقہ کرتا ہے، کیوں کہ دولت منداور طاقت ور ہے۔''چھٹیاں لے کر یورپ اور امریکہ جاتے ہیں، ان کی اولاد بھی مغربی ممالک میں پڑھ رہی ہے۔انہوں نے لاکھوں روپیہ (اب اربوں روپیہ) سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں جمع کرلیا ہے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو بات بات پر دوسروں کو غدار اور وطن فروش کے نام سے نوازتے ہیں اور حبِ وطن کا سارا ٹھیکہ انہوں نے خود لے رکھا ہے، یہی سب لوگ خود انگلستان یا کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔مسلمان قوم کی تاریخ کا یہ ہولناک دور ہے''(۲۰)

انیس سو پچاس کے عشرے میں یہاں ''فرسٹریشن'' کی جو صورتِ حال تھی وہی زیادہ شدت کے ساتھ آج ہے۔ سیاست، ادب، کلچر، مذہب، کا 'ریکٹ'' اسی طرح آج بھی اعلیٰ پیمانے پر چلایا جاتا ہے۔صحافت کے روپ میں جھوٹ اور ادب کے نام پہ لغویت آج بھی تخلیق ہورہی ہے۔نافرمان یہودیوں کو چالیس سال کی گمراہی کے بعد ارض موعود مل گئی تھی اور یہ فرمانبردار قوم جو اسلام سے اتنی محبت کرتی ہے اور اس کے ہر معاملے میں اسلام اس قدر دخیل ہے کہ کبھی 'دوسرے مسلمان ملک اس بات ہر خوب چڑتے تھے' ستر سال سے کیوں بھٹک رہی ہے؟ ہمارے ملک کے مناظرہ باز دائیں بازو کے رہنماؤں نے ایک طرف مغرب اور مغربی تہذیب کو''چاند ماری'' بنائے رکھا اور دوسری طرف ان کا ہدف ملامت ہمسایہ ملک ہے۔ہم جو کام نصابِ تعلیم سے نہیں لے سکے وہ کام ہمارے ''دشمنوں'' نے جدید ذرائع ابلاغ سے لے لیا ہے۔تہذیبی مقالمہ تو اب بھی جاری ہے۔پچھلے دو عشروں سے بالخصوص ہندو پاک کے عام طبقے کی عورت اور نوجوان پھر سے ایک ہے ثقافتی سطح پہ آ چکے ہیں اور طبقہ عالیہ کی ثقافتی معروضیت تو روزِ اول سے ہی مغربی تھی۔ہم نے کہاں کہاں بند نہیں باندھے اور کہاں کہاں سے یہ نہیں ٹوٹے۔جب پوری دنیا اپنی شناخت سے دست بردار ہوئے بغیر ایک دوسرے کے جغرافیوں، نسلوں، مذہبوں اور ثقافتوں میں دلچسپی لے رہی ہے اور جب جدید ذرائع ابلاغ نے پورے عالم کے تمام اچھے برے کو سمیٹ کر جدید نسل کی جیب میں ڈال دیا ہے تو اب یہ معاملہ خود اس نسل پہ چھوڑ دینا چاہیے کہ اپنی تہذیب وثقافت سے متعلق وہ خود فیصلے کرے۔اگر مشرق نے بابو پیدا کیے ہیں تو مغرب ملا اور سادھو پیدا کرنے میں کون سا پیچھے رہا ہے۔مغرب میں کروڑوں مشرقی خاندان مغربی طرز حیات کے ساتھ آباد ہیں اور مشرق میں پورے شہر کے شہر مغربی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔کلب اور آشرم میں جانے کے لیے مشرق اور مغرب کی کوئی شرط نہیں ہے۔کمال کا ایک فرنچ پروفیسر بھی تو سادھو بن کر جنگل کی طرف بھاگ گیا تھا۔

کیا دنیا میں واقعی کسی مذہب کو نابود ہونے کا خطرہ ہے کہ قومیں بات بات پر مذہبی جنگیں لڑنے کے لیے تیار ہوجاتی ہیں۔مذہب تو ''ریکٹ'' ہے۔جنگوں کے اصل اسباب اور مقاصد کبھی مذہبی نہیں رہے۔قدیم ارواح اور اصنام کو پوجنے والے چھوٹے چھوٹے مذاہب کا خاتمہ جب عیسائیت اور اسلام کی وسیع تبلیغی سرگرمیوں کے باوجود

نہیں ہوسکا تو خود عیسائیت، اسلام اور ویدانت کو کیا خطرہ ہے جن کے پیروکاروں کی تعداد کبھی کروڑوں سے کم نہیں رہی۔ ''اسلام جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ان گنت معاون ندی نالوں کو اپنے دھاروں میں سمیٹ کر ایک عظیم الشان آبشار کی صورت میں رواں دواں تھا اب وہ سمٹ سمٹا کر ایک مٹیالے نالے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ نالہ ایک وسیع بھیڑ میں بہہ رہا ہے جس کے چاروں طرف سے بند باندھے جا رہے ہیں''(۲۱) اسلام محض اس لیے سچا مذہب نہیں ہے کہ اپنی سچائیوں کو پیش کرتا ہے، اسلام کی عظیم ترین سچائی یہ ہے کہ تمام مذاہب میں موجود سچ کی گواہی دیتا ہے۔ اسلام غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور تمام مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ مکالمہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور جب اس زمانے میں تہذیبی تصادم کو ہوا دی جا رہی ہے، تو یہ ضروری ہے کہ دانشوروں کے افکار میں موجود تہذیبی مکالمہ پر توجہ دی جائے۔

حوالہ جات

۱۔ قرۃ العین حیدر، ''آگ کا دریا''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱

۲۔ ایضاً، ص ۴۵ ۳۔ ایضاً، ص ۴۲ ۴۔ ایضاً، ص ۹۱ ۵۔ ایضاً، ص ۸۰۱ ۶۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۷۔ محمد حبیب نظامی، خلیق نظامی، ''جامع تاریخ ہند''، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۹۲۸

۸۔ قرۃ العین حیدر، ''آگ کا دریا''، ص ۱۳۱

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۶ ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۶ ۱۱۔ ایضاً، ص ۱۹۲ ۱۲۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۱۵ ۱۴۔ ایضاً، ص ۲۰۲ ۱۵۔ ایضاً، ص ۴۶۲

۱۶۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، ''برِ صغیر میں اردو ناول''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۴۷

۱۷۔ قرۃ العین حیدر، ''آگ کا دریا''، ص ۴۵۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۵۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۲۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۲۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۲۴